ہے۔ صدارت پر فائز ہوتے ہی انہوں نے بوسنیا کے بارے میں مسلح جدوجہد سے متعلق اپنی رائے میں نرمی پیدا کرلی مبادا ان کے فلاحی منصوبوں کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ویت نام کی جنگ کے سبب لنڈن جانسن کے منصوبے ''عظیم معاشرے'' کا ہوا تھا۔ برٹ نے بوسنیا کے پس منظر میں ویت نام کے استعارے پر پورا باب وقف کیا ہے مگر وہ اس مرکزی حیثیت کا کہیں ذکر بھی نہیں کرتا۔

وہ بوسنیا پالیسی اور نیٹو کی توسیع میں کسی رابطے کا ذکر کرتا ہے اور نہ ہی اس امر پر روشنی ڈالتا ہے کہ بوسنیا کے مسئلہ میں نیٹو کس طرح گھسیٹ لی گئی۔ وہ یہ بھی بیان نہیں کرتا کہ یوگوسلاویہ کا نقطہ نظر کیا ہے۔ آخر یہ کیسے ہوا کہ بوسنیا کے مسلمان، شہری اور شائستہ شمار ہوئے اور سربوں کو دیہاتی اور کم تعلیم یافتہ گردانا گیا۔ یہ موجودہ عسکری اور سیاسی قوت میں نسلی نمائندگی کا کلیدی نکتہ ہے کہ بوسنیا میں مسلمان سیاسی اور غالب عنصر کیسے بن گئے جب کہ زیادہ تر اراضی سربوں کے قبضے اور ملکیت میں تھی۔ برٹ اس بارے میں اپنے قارئین کو بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے نوئیل میلکم کی کتاب ''بوسنیا کی مختصر تاریخ'' کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس طرح برٹ نے سیاسی حوالوں کو نظر انداز کیا ہے حالانکہ ان کی فیصلہ کن حیثیت ہے۔

برٹ نے کتاب کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے اس اجمالی جائزے میں متعدد رجحانات اور تفاصیل سے صرفِ نظر کیا ہے۔ اس خامی کے سبب اس کتاب کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کتاب کے چوتھے جزو کے علاوہ برٹ کہیں بھی تفاصیل بیان نہیں کرتا۔ کلنٹن انتظامیہ اپنی پالیسی کی بدولت بوسنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی بلکہ سربوں کو یورپی منصوبے کو رد کرنے کا موقع فراہم کر کے قیام امن کے منصوبے کو نقصان ہی پہنچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امن کے حصول میں دو سال صرف ہوئے اور بے شمار افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خارجی عوامل پر چلنے والے امریکی

میسٹر ووچ کی کتاب کا آغاز بہت دلچسپ ہے۔ اس نے ڈیوڈ ریزمین کے اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ ایک راہ باطنی ہوتی ہے اور دوسری غیر باطنی۔ اول الذکر ان اقدار سے تحریک پاتی ہے جو معاشرے میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ مؤخر الذکر کا مقصد محض دوسروں کو خوش کرنا اور بیوقوف بنانا ہوتا ہے۔ میسٹر ووچ

نے تحریر کیا ہے کہ ''مغرب نے ایسی داخلی اقدار کو نقل کرنے، ان سے جھوٹے تعلق پیدا کرنے اور ان کی جعلی تخلیق کی راہ اختیار کی ہے جو اب ناپید ہو چکی ہیں اس کا نتیجہ ریاکاری اور ظاہرداری کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس نے یہ سوال کیا ہے کہ اہلِ مغرب روشن خیالی کی روایات کے حامل ہوتے ہوئے عرب کی اس نسل کشی کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں جس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ ان کی سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ ایک طرف جنگ ہو رہی ہے اور دوسری طرف انسانی ہمدردی کے تحت امداد بھیجی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں امن کا ایسا معاہدہ ٹھونسا جاتا ہے جس کی رو سے نیٹو کی افواج کے وہ حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں جو قیامِ امن کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مغربی قیادت نے بوسنیا کے بارے میں جو اعلانات کیے وہ اس میں سنجیدہ نہیں تھے یہ سب کچھ محض ڈھکوسلا اور نیک چلن نظر آنے کی کوشش تھی۔ میسٹر ووچ جب ''تفاخرِ معصومیت'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ''مقصد میں خود غرضی اور الفاظ میں بے غرضی''۔

مغربی قیادت نے بوسنیا کے بارے میں جو اعلانات کیے وہ اس میں سنجیدہ نہیں تھے یہ سب کچھ محض ڈھکوسلا اور نیک چلن نظر آنے کی کوشش تھی۔

اس نکتہ نظر میں درستی مضمر ہے۔ مغرب کے چند رہنماؤں کی دیانت پر شک وشبہ بلا جواز نہیں۔ یہ کہنا کہ بل کلنٹن ظاہر پرست ہے موجودہ حالات میں حقائق سے اتنا ہی قریب ہے جتنا یہ کہنا کہ پوپ کا وطن پولینڈ ہے۔

میسٹر ووچ کا کہنا ہے کہ امریکہ میں مستقبل کے بارے میں امیدوں نے بڑے پیمانے پر مایوسی کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ قدامت پسند اب اس قابل نہیں رہے کہ وہ داخلی طور پر ان اخلاقی اور سیاسی اہداف کا اظہار کر سکیں جس سے مستقبل کی تعمیر ہو۔ آزاد خیال افراد میں اتنی اہلیت نہیں کہ وہ طویل مدت کی مخصوص اقدار کو اختیار کریں۔

امریکہ اب ایسا روشن مینار نہیں رہا جو کسی پہاڑ پر قائم ہے اور جو تمام دنیا میں جمہوریت کی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ آج کل کے امریکی اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ ان میں وہ لگن ہے نہ

ہی سنجیدگی۔ تاہم امریکہ اب بھی غالبًا ایسا مصنوعی مینار ہے جو ساری دنیا میں ایک بناوٹی رجائیت، ایک جعلی تفاخر اور سب کچھ کر گزرنے کی عقلی روشنی منعکس کرتا رہتا ہے۔

بوسنیا میں امریکی پالیسی کی تشریح کے لیے ان چند امور پر توجہ دینا ضروری ہے۔

ا۔ سابقہ یوگوسلاویہ کی جنگیں نسل کشی پر مشتمل تھیں۔

۲۔ امریکہ پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسے روکنے کے لیے مصارف بھی برداشت کرے اور خطرات بھی مول لے۔

۳۔ قیام امن کے لیے غیر ملکی فوج کے لیے لازم ہے کہ وہ جنگی مجرموں کا تعاقب کرے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائے۔ ان امور کے علاوہ کسی اور بات پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ لیکن ان میں ہر مفروضہ غلط ہے۔

> میسٹر ووچ جب ''تفاخر معصومیت'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ''مقصد میں خودغرضی اور الفاظ میں بے غرضی''۔

نسل کشی کی اصطلاح بڑی موثر ہے۔ اسے یوں ادھر اُدھر ضائع نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اس کے اخلاقی مضمرات کو قانون دانوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ نسل کشی کسی قوم کی طرف سے دوسری قوم کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا نام ہے۔ لیکن موجودہ جنگوں میں سربوں کا عمل کتنا ہی ظالمانہ اور وحشیانہ کیوں نہ رہا ہو وہ بیسویں صدی سے قبل کے اس رویے سے مشابہ تھا جو زمین پر قبضہ کرنے کے لیے مستعمل تھا اور غلط طور پر قابضین کو ہٹانے کے لیے دہشت گردی عام تھی۔ سربوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ فوجی خدمت کے لائق افراد کو قتل کر دیا جائے وہ نسل کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ مقصد ہوتا تو وہ بوسنیا اور کروشیا کی عورتوں اور بچوں کو کیمپ میں لے جا کر ختم کر دیتے انہیں سرحد پار دھکیلنے پر اکتفا نہ کرتے۔

ان حقائق کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ یہ جنگیں سربوں کی نسل پرستی، توسیع پسندی اور اشتعال انگیز جارحیت کی پیدا کردہ تھیں جیسا کہ کتاب ''تفاخرِ معصومیت'' میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بلقان میں آگ لگانے والے خوف کے سلسلے حقیقی تھے۔ کروشیا اور سلوینیا کو یہ خطرہ تھا کہ اشتراکیت کے خاتمہ کے بعد سربوں کا تسلط قائم ہو جائے گا اور اس طرح کروشیا کی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس صورتِ حال میں بوسنیا کے مسلمانوں میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ وہ سربوں کے ظلم وستم سہنے کے لیے تنہا رہ جائیں گے اور انہوں نے

آزادی کی راہ اختیار کی۔

میسٹر ووچ کا یہ بھی خیال ہے کہ سربوں نے نہ صرف کروشیا والوں کی نسل کشی کی بلکہ مسلمانوں کو بھی من حیثیت القوم مٹانے کے درپے تھے۔لیکن امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا۔ جیسا کہ رچرڈ جانسن نے جو یوگوسلاویہ ڈیسک سے متعلق تھے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے۔اس نظریے کو فارن سروس کے مستعفی افسر اسٹیفن ڈبلیو واکر نے اپنے مضمون ''نسل کشی۔ہم ذمہ دار ہیں'' میں بڑی باریک بینی سے رد کیا ہے۔

لیکن یہ معاملہ منافقت کا نہیں تھا۔حقیقتاً حالات ہی بہت گنجلک تھے۔ جہاں تک بلقان میں جنگی جرائم بشمول نسل کشی کی ذمہ داری کے تعین کا تعلق ہے بوسنیا کے سربوں، کروٹوں اور مسلمانوں نے جو زیادتیاں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھی ہیں اس کی ذمہ داری مغرب پر ڈالنا ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے۔ دو متحارب گروہوں کے درمیان صلح صفائی کے لیے بیچ بچاؤ کرنا نیکی کا عمل بھی ہے اور چند صورتوں میں ناگزیر بھی خواہ اس میں جان و مال کے ضیاع کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔لیکن اگر تیسرا فریق مداخلت نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس قاتل کا بنیادی گناہ معاف نہیں ہو جاتا۔ یہاں کتاب کے دوسرے نظریہ کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے۔

جہاں تک بلقان میں جنگی جرائم بشمول نسل کشی کی ذمہ داری کے تعین کا تعلق ہے بوسنیا کے سربوں، کروٹوں اور مسلمانوں نے جو زیادتیاں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھی ہیں اس کی ذمہ داری مغرب پر ڈالنا ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے۔

میسٹر ووچ اور ان کے معاصر یہ سوچتے ہیں کہ بلقان میں سرزد ہونے والی غلطیوں کی اصلاح کی ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ برخلاف برٹ کے وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس مسئلہ پر امریکہ کی سلامتی کا مسئلہ پیدا ہوا تھا یا نہیں؟ وہ اس موضوع پر یوں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ گویا ساری دنیا کو امریکی افواج اور خزانہ پر مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔

۱۹۹۰ء میں امریکیوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ دھندلا گیا ہے۔امریکی رائے عامہ یہ پوچھتی ہے کہ امریکہ جنگ سے تباہ شدہ بوسنیا پر اتنی رقم کیوں صرف کرتا ہے جب کہ خود امریکہ کے اجڑے ہوئے

شہروں میں مرمت کے لیے سرمایہ درکار ہے۔

تاہم امریکہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ امریکہ جیسی عظیم قوت کی خارجہ پالیسی پر دنیا بھر کے ملکوں میں فلاحی کاموں کا اثر ضرور پڑنا چاہیے۔

امریکہ نے بلقان میں مداخلت کا جو فیصلہ کیا اس میں کسی قسم کا کوئی اخلاقی پہلو شامل نہیں تھا۔ بلکہ باہم متضاد پہلو اس فیصلے میں نمایاں ہیں۔ یہاں یہ سوال محض حربی حکمت علمی کا تھا۔ امریکہ اگر بلقان میں فوجی مداخلت کا فیصلہ پہلے کرتا تو یورپ کی سلامتی کے بارے میں سوچ کو پنپنے کا موقع نہ ملتا اور ہوسکتا ہے اُس وقت زیادہ امریکی فوجی کام آتے جنہوں نے امریکہ کے تحفظ کا حلف اٹھایا ہے ساری دنیا کی سلامتی کا نہیں۔ مزید برآں ایسی ناکامی کا سامنا ہوتا کہ امریکی رائے عامہ اس طرح کی مداخلت کی اس وقت بھی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتی جب ایسا کرنا خود امریکہ کے اپنے مفاد میں ہوتا۔ جو لوگ ایک وقت میں صرف ایک ہی اخلاقی مسئلہ پر توجہ مرکوز رکھ سکتے ہیں انہیں حالات کے اس بڑے چکر سے دور ہی رکھنا مناسب رہے گا جس کی بنیاد پر حکومت اپنی حکمتِ عملی مرتب کرتی ہے۔

آخرکار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ نیٹو نے مداخلت کی، جو جزوی تھی، تلون کا شکار تھی۔ اور جس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس پر میسٹر دوچ اور اس کے ہم عصروں کی رائے بالکل درست ہے کہ یہ برطانوی وزیراعظم نیولی چیمبرلین کے دور سے آج تک کی اخلاقی دیوالیہ پن کی بدترین مثال تھی۔ اسی لیے ڈیوڈ ریف کو لکھنا پڑا کہ گزشتہ نصف صدی کی بدترین جنگ ان لوگوں نے لڑی جو جنگ شروع ہو جانے سے حیرت میں ڈوبے رہے۔ یہ وہی دوسری قسم کی سوچ تھی، ناممکن کو گلے لگانے کا جذبہ تھا، جس کا انجام غیر ذمہ دارانہ عمل کی صورت میں رونما ہوا۔

اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی صورت حال میں حصولِ انصاف کے اکلوتے مقصد پر ہی ڈٹے رہنے سے خود ''امن'' کو خطرہ درپیش آسکتا ہے۔ بعض تو انصاف کو اتنا اہم سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک اس کے حصول کے لیے جنگ کو طول دینا بھی جائز تھا۔ کتاب ''تفاخرِ معصومیت'' میں شامل بیش تر اہل قلم کے لیے اس طرح کا متضاد لین دین کبھی رونما نہیں ہوا۔ اس طرح کی کم نظری کی بنیاد پر شروع کی گئی جنگ ہی دراصل تفاخرِ معصومیت ہے۔